بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

آج کل مسلمان ملکوں کو، جو ابھی ابھی صدیوں کی سیاسی غلامی، معاشی بدحالی اور سماجی جمود سے نکلے ہیں، داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو رہے ہیں۔ مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو بہرحال ان مشکلات اور مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے اور وہ مجبور ہیں کہ اس ضمن میں اپنی پالیسیاں بنائیں اور اپنے عوام سے ان پر عمل کرائیں۔ دنیائے اسلام بالکل ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اسے اس وقت نئے حالات درپیش ہیں، جن کی مثال تاریخ اسلام میں شاید ہی ملے۔ نئے حالات نئی تبدیلیوں کے متقاضی ہوا کرتے ہیں اور اگر قومیں یہ تبدیلیاں شعوری طور پر خود نہ لائیں تو یہ تبدیلیاں خود آ کر رہتی ہیں، اور قومیں مجبور ہوتی ہیں کہ انہیں قبول کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ نئے حالات کے تحت ہمیں اپنی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں کرنا ہوں گی، اور جن کا کیا جانا ایک ناگزیر امر ہے، اس بارے میں ہماری مذہبی جماعتوں کا کیا موقف ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے اب وہ زمانہ نہیں رہا، جب مسلمان سلاطین کو امور مملکت میں معمولی سے معمولی تبدیلی کرنے کے لیے شیخ الاسلام کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اور اس سے رضامندی حاصل کیے بغیر ہر تبدیلی تخت و تاج کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی تھی، آج مسلمان مملکتوں کی ہیئت سیاسی بالکل دوسری ہے اور ان کی قیادت و سیادت اور طرح کے طبقوں اور عناصر کے ہاتھ میں ہے۔ پھر نئے حالات نہ صرف بڑے دور رس، اثر آفریں اور ہمہ گیر ہیں بلکہ ان کی رفتار بے حد تیز ہے اور خاص طور سے ہمارے جیسے ملکوں میں جہاں صدیوں سے جمود نے وقت کو ساکن کر رکھا تھا،

یہ رفتار اور بھی زیادہ تیز ہے۔ ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو فوری فیصلے کرنا پڑتے ہیں اور عملاً ہر مسلمان ملک یہ کر رہا ہے۔ وہ اس پر مجبور ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آج کوئی بھی مسلمان ملک ایسا نہیں، جہاں بعض مسیحی یا غیر مسیحی ملکوں کی طرح مذہب کا ایک قومی و ملکی پالیسی کے طور پر انکار کیا جا رہا ہو، یہاں تک کہ اب ترکی میں بھی چالیس سال کے "سیکولرزم" کے باوجود عوام کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن اگر مذہبی طبقوں کی طرف سے ان سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیوں کی مخالفت کی گئی، جنہیں برتنے کار لانا نئے حالات کا ضروری تقاضا ہے، تو پھر مسلمان ملکوں کی سیاسی قیادتوں اور مذہبی طبقوں میں تصادم ناگزیر ہو جائے گا، اور اس تصادم کا جو نتیجہ نکلے گا، اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ہماری تاریخ کے ایک دور میں ہمارے مذہبی طبقوں کا ایک خاص "رول" رہا ہے۔ ان کے اس "رول" کی عظمت و افادیت سے ہمیں انکار نہیں، لیکن تاریخ کا وہ دور گزر گیا۔ اب وہ واپس نہیں آسکتا اور نہ ہمارے مذہبی طبقے وہ "رول" دوبارہ ادا کر سکتے ہیں۔ اگر مذہبی طبقے سیاسی قیادتوں کے حریف بنے اور مذہب کے نام سے اور عوام سے مذہب کی اپیل کر کے انھوں نے مسندِ اقتدار کو حاصل کرنے کی کوشش کی تو مصر کے اخوان المسلمین کا سا معرکہ ہر مسلمان ملک میں ہو گا، لیکن اگر انہوں نے اپنے لیے ایک مرشد، امام، استاد، ریفارمر اور حق گو واعظ و مبلغ کا منصب پسند کیا، تو سیاسی قیادتیں بھی اُن کی بات سنیں گی اور قومی و عوامی زندگی پر بھی ان کا دیرپا اور دُور رس اثر قائم رہے گا۔ ہمارے ہاں بھی جماعتِ اسلامی کے بزرگوں کو ان دو مناصب میں سے صرف ایک منصب اختیار کرنا ہو گا۔ یا تو وہ خالصتاً سیاسی اقتدار کے حریف بنیں اور بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے سرگرم کار ہوں، یا ان کا منصب ایک "مرشد، امام اور استاد" کا ہو اور وہ سیاسی اقتدار کے لیے مذہب کی سٹیج کو استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ خدانخواستہ اگر مذہب و سیاست کے متعلق ان بزرگوں کا یہی موقف رہا، جو اب تک تھا، تو اس سے اسلامیت کو بھی گزند پہنچے گا اور ملک کی سیاست بھی صحیح راہوں پر نہ چل سکے گی۔

قوم مذہبی جماعتیں جو مذہب کے نام سے اور مذہب کی سٹیج سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی

ہیں، اُن کا مصر میں جو انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ انڈونیشیا میں بھی کم و بیش یہی قصہ دُہرایا جا چکا ہے۔ ایران میں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا، اس کی تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں۔ ہر مسلمان ملک میں جہاں اس طرح کا تصادم ہوگا اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیئے اور روزمرہ کی عملی سیاست اور مذہب کو اس طرح گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے کہ دونوں میں تصادم ہو اور افراط و تفریط کی راہیں کھُلیں۔

سیاسی قیادتیں خواہ وہ کتنی بھی بلند و فائق کیوں نہ ہوں، تنقید، نصیحت اور تنبیہہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے علمائے کرام دینی حدود میں رہ کر یہ فرائض بوجہ احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔ اور تاریخ میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں، جب ایک جابر سے جابر سلطان کے سامنے ایک عالم کلمۂ حق کہتے ذرا نہیں ڈرتا تھا اور سلطان بھی اسے سنتا تھا۔ آج منبر کی خود اپنی ایک عظمت ہے، اسے کرسیٔ اقتدار کا زینہ نہ بنایئے۔ اس سے تصادم ہوگا، خلفشار بڑھے گا اور ملک و قوم کو نقصان پہنچے گا۔

کونسا سنگ دل سے سنگ دل مسلمان ایسا ہوگا جو مغربی بنگال میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی کی خبریں پڑھ کر رو دیا ہو۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے سولہ سال ہو گئے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اب بھی آئے دن وہاں مسلمانوں پر یلغاریں ہوتی ہیں اور ان کو بے دریغ قتل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ہندو فرقہ پرستوں کی سفاکی اور خون خواری کی زبان پر گویا اب بھی ہل من مزید ہے۔ اور اس سرزمین کے کسی حصے کا مسلمان بھی اپنے آپ کو اس سے محفوظ نہیں پاتا۔ معلوم نہیں اس مسلم دشمنی کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔ اور ہمارے ہمسائے ملک میں ہمارے بھائیوں کا خون کب تک یوں بہے گا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادارۂ علوم اسلامیہ کے ایک ریسرچ اسسٹنٹ صاحب علی گڑھ سے لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مکتب خیال کے مشہور اصحاب میں سے سب سے کم کام حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب پر ہوا ہے چنانچہ وہ انہی پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے کہ وہ اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے دور کے جملہ حالات و کوائف جمع کر رہے ہیں۔ اور اس تاریخی پس منظر میں وہ حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات و تصنیفات کا جائزہ لیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ ولی اللّٰہی تحریک کی عمومی و عوامی حیثیت کے بانی شاہ عبدالعزیز صاحب تھے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے افکار و خیالات کو جس طرح عوام مسلمانوں تک پہنچایا، اس کو اب تک صحیح طرح سمجھا نہیں گیا۔ ضرورت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز پر زیادہ تحقیقی کام ہو، اور ان کی طویل زندگی کی کوششوں کا پورا جائزہ لیا جائے۔